ڈاکٹر ذاکر حسین میموریل توسیعی خطبہ

بہ اشتراک قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

سر سیدؒ کے ذہنی ارتقا کا پس منظر

از

پروفیسر بی۔ شیخ علی
(بانی وائس چانسلر منگلور اور گوا یونیورسٹی)
مدیر اعلیٰ، روزنامہ سالار بنگلور

سنہ ۲۰۰۰ء

شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

شروع کی بات

دانش گاہوں میں توسیعی خطابات کی روایت نئی نہیں ہے۔ان خطبات کے توسط سے علم وفن کے مختلف گوشے نئے انداز نظر کے ساتھ سامنے آتے رہے ہیں اور علمی کام کرنے والوں کے لئے نیا مواد فراہم کرتے رہے ہیں۔ خطبات سے فکروفن کا دائرہ وسیع ہوتا ہے۔ یہ کبھی کبھی تسلیم شدہ حقائق کی تردید کرتے ہیں اور کبھی نئے دلائل کے ساتھ ان کی توثیق کرتے ہیں۔ڈاکٹر ذاکر حسین میموریل خطبہ اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جسے ہماری درخواست پر پروفیسر بی شیخ علی نے تحریر فرمایا ہے۔

پروفیسر بی شیخ علی کی عالمانہ اور مفکرانہ شخصیت محتاج تعارف نہیں۔ آپ ایک روشن ضمیر مورخ،ایک شفیق معلم اور ایک عالم بے بدل ہیں۔ملک کی علمی سرگرمیوں میں آپ کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ گذشتہ نصف صدی میں تاریخ کے موضوع پر آپ نے تقریباً دودرجن سے زائد کتابیں لکھی ہیں جن میں بیشتر کتابیں حوالے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ آپ کی تصنیف 'ٹیپو سلطان شہید' کو علمی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ آپ کا شمار برصغیر کے ممتاز سرسید شناسوں میں ہوتا ہے۔ ابھی حال ہی میں آپ نے اپنی تصنیف A Leader Reassessed میں سرسید کی قائدانہ اور مصلحانہ سرگرمیوں کا تجزیہ بڑی ژرف نگاہی سے پیش کیا ہے۔ آپ علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے نہ صرف ممتاز طالب علم رہے ہیں بلکہ آپ کو اس دانش گاہ اور اس کے بانی سے گہرا والہانہ لگاؤ ہے۔پیش نظر خطبہ میں پروفیسر بی شیخ علی نے مختلف مذہبی اور ثقافتی تحریکوں کے پس منظر میں سرسید کے ذہنی ارتقا کے نقوش واضح کئے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ شعبہ اردو کی دیگر مطبوعات کی طرح اسے بھی حسن قبول حاصل ہوگا۔

ڈاکٹر ذاکر حسین میموریل خطبہ کا انعقاد حکومت ہند کے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے تعاون سے ہورہا ہے۔ میں بطور خاص اس ادارے کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ میرا خوشگوار فریضہ ہے کہ اس موقع پر جناب محمود الرحمٰن صاحب وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی کا شکریہ ادا کروں جن کا تعاون ہمیں ہر مرحلے پر حاصل رہا۔ میں اپنے رفقائے شعبہ کے تعاون کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں۔

اصغر عباس

صدر شعبہ اردو، مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

ذاکر حسین میموریل توسیعی خطبہ

سر سید کے ذہنی ارتقا کا پس منظر

معزز حاضرین!

مالک کا لاکھ کرم و احسان ہے کہ ایک حقیر بندہ کو آج ایک ایسا اعزاز حاصل ہو رہا ہے جو شاید چند ہی خوش نصیبوں کے حصہ میں آیا ہو، یعنے اپنے ہی مادر درسگاہ میں، اپنے ہی بزرگوں کو خراج عقیدت پیش کرنے، ان کی یاد کو دلوں میں تازہ کرنے، اور ان کے نقش قدم پر چلنے کی تلقین کرنے کا ایک نادر موقع، اسی درسگاہ کے ایک ادنیٰ طالب علم کو حاصل ہو رہا ہے۔ میرے نزدیک یہ سعادت کئی نوبل پرائز سے افضل ہے۔ بندہ شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی، علی گڈھ کا اور بالخصوص پروفیسر اصغر عباس صاحب کا بے حد ممنون و مشکور ہے کہ انہوں نے میری کوتاہیوں کو نظر انداز کر کے مجھے ذاکر حسین میموریل خطبہ پیش کرنے کا شرف بخشا ہے۔ مجھ سے بڑھ کر کسی اور کو میری کوتاہیوں کا اندازہ نہ ہوگا۔ ایک تو کوثر و تسنیم سے دھلی ہوئی، دہلی اور لکھنؤ میں پلی ہوئی، زبان اردو کے جادو کو کرناٹک کا باشندہ کیا جانے؟ جس شخص نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ فرنگی زبان میں درس و تدریس کے لئے وقف کر دیا ہو وہ اس درسگاہ میں باریاب ہونے کی جرأت کیوں کر سکتا ہے، جس کے در و دیوار حالی، شبلی، حسرت موہانی، ظفر علی خان، رشید احمد صدیقی، آل احمد سرور اور دیگر کئی عظیم ہستیوں کے نقوش سے منور ہیں؟ میرا تعلق شعبۂ اردو سے نہیں، شعبۂ تاریخ سے رہا ہے۔ ادیب و شاعر خیالات، جذبات و محسوسات کو لطیف طریقہ سے پیش کر کے سامعین کو مسحور کر دیتے ہیں، ولولہ و جوش ابھار دیتے ہیں۔ ایک روکھا پھیکا معقولات کا مورخ اس کمال کو کیا جانے؟ تاہم اس حقیر کی یہ کوشش رہے گی کہ اس چشمہ حیات سے فیض پانے والے ارباب علم و دانش کی محفل میں دو چار باتیں کہنے کی سعادت حاصل کر لوں۔

موضوع پر کچھ کہنے سے پہلے ایک بات عرض کرنی ہے کہ قدرت کے بھی عجیب کرشمے ہیں۔ انیسویں صدی کے آخری تین سال تاریخ ساز رہے ہیں۔ ۱۸۹۷ء میں ذاکر صاحب کی ولادت، ۱۸۹۸ء میں سر سید کی رحلت اور ۱۸۹۹ء میں ٹیپو سلطان کی شہادت کی پہلی صدی، یعنے ملت کی بیداری و آگہی کا بار بار اشارہ کہ خواب غفلت سے جاگ جاؤ، اپنے تاریخی ورثہ پر نظر ڈالو اور دیکھو کیسے کیسے اہل شہادت، اہل احسان اور اہل جمال تمہیں بخشے گئے ہیں۔ شہید دوسروں کے لئے جان دیتا ہے، محسن دوسروں کے لئے زندہ رہتا ہے، جمیل حسن کی تشکیل کرتا ہے۔ شہید اپنی جان قربان کرتا ہے تاکہ دوسروں کو زندگی ملے۔ محسن اپنی ہر سانس کو دوسروں کے لئے وقف کرتا ہے تاکہ دوسروں کی حالت بہتر ہو۔ جمیل حسن سیرت کی جستجو میں رہتا ہے تاکہ دوسروں کو ایک اخلاقی شخصیت نصیب ہو۔ اہل شہادت، اہل احسان اور اہل جمال سے قوموں کی زندگی بنتی ہے۔ کہتے ہیں دانائی اگر اہل شہادت کو ملی تو جنون کہلائی، اہل احسان کو ملی تو خیر کثیر کہلائی اور اہل جمال تک پہنچی تو حسن بن گئی۔

مالک کا شکر کیسے ادا کیا جائے کہ شہادت کی مثال ٹیپو میں، محسن کی مثال سر سید میں اور جمیل کی ذاکر صاحب میں پیش کر کے ہمیں ہدایت کے نور سے بھر دیا ہے۔ ان تینوں کا مقصود ایک ہی تھا۔ یعنی ایمان، اسلام، احسان، ان تینوں کی آرزو ایک ہی تھی یعنی تلاش حق، تحصیل علم و خدمت خلق۔ ان تینوں کا مرکز محسوس ایک ہی تھا یعنے خدا بینی و خود بینی و جہاں بینی اور ان تینوں کی تعلیمات کے اشارات ایک ہی تھے۔ یعنی ایک قلب دردمند، ذہن ارجمند و زبان ہوشمند۔ ان تینوں نے ایک دانش گاہ کی بنیاد ڈالی تھی تاکہ بشر عین الیقین سے نکل کر علم الیقین ہوتے ہوئے حق الیقین تک پہنچ جائے۔ ٹیپو نے دار الامور کی (امر یعنے کام یعنے تکنیکی درسگاہ) سر سید نے علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کی اور ذاکر صاحب نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کی۔ ٹیپو کو مہلت نہ ملی مگر سر سید اور ذاکر صاحب نے اس خواب کو سچا کر دکھایا۔ ہمیں یہ یاد رکھنا ہو گا کہ

ہم ایک چراغ اندھیرے میں نہ کر سکے روشن   دیئے بزرگوں نے طوفان میں جلائے ہیں

سامعین! پروفیسر اصغر عباس صاحب نے مجھے اشارتاً لکھا تھا "آپ کے خطبہ کا

موضوع اگر سر سید کا کوئی پہلو ہو تو بہت مناسب ہو"۔ اس مختصر سی صحبت میں بندہ سر سید کے کارناموں کے بحر بیکراں کا تذکرہ چھیڑنا نہیں چاہتا بلکہ ان کی ذہنی نشو و نما میں کن عناصر کا ہاتھ ہے، اس پر ہلکی سی روشنی ڈالنے کی اجازت چاہتا ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ذہن انسانی سے بڑھ کر اس کائنات میں اور کوئی شئے نہیں، قدرت کی کوئی اور تخلیق نہیں۔ اس ذہن سے آج بشر قمر پر قدم رکھ چکا ہے۔ آفتاب جہاں تاب کے شعاعوں کی تسخیر معمولی بات بن گئی ہے۔ تنکے کو توڑ کر بجلی کی قوت پیدا کرنے کا سبق ہر کالج میں پڑھایا جاتا ہے۔ فضا میں اڑنا، سمندروں کی تہہ چاٹنا، دل کے بجھتے چراغ کو پھر سے بھڑکانا، ستاروں پر کمند ڈالنا وغیرہ باتیں آج الف لیلہ کی کہانی نہیں۔ انفارمیشن تکنالوجی، فضائی تحقیق، الیکٹرانک اور کمپیوٹر کی وجہ غضب کے انقلابات ظہور میں آرہے ہیں۔ یہ سب ذہن انسانی کے کمال ہیں جو تسخیر کائنات میں لگا ہوا ہے۔ اس ذہن کی ایک شرر سر سید کی سوچ میں مضمر تھی۔ جو بعد میں شعلہ بن کر ملت میں ایک انقلابی روح پھونکنے کا باعث بنی۔ وہ شرر اگر علامہ اقبال کی زبان میں کہا جائے تو وہ احساس شدید تھا۔

کس طرح ہوا کند تیرا نشتر تحقیق ہوتے نہیں کیوں تجھ سے ستاروں کے جگر چاک

تاریخی پس منظر ...... سر سید کے ذہن میں یہ بات آئی کہ مسلمانوں کے زوال کا سب سے اہم سبب ان کی علوم و فنون کی کوتاہی تھا۔ سیاست، حکومت اور شہنشاہیت کے غرور میں انہوں نے درسگاہوں و دانش گاہوں کو خیرباد کہہ دیا تھا۔ اس کے برعکس یوروپی اقوام نے علوم و فنون میں وہ حصہ لیا کہ وہاں نشاۃ ثانیہ (Renaissance) برپا ہو گیا۔ اس نشاۃ ثانیہ کی داغ بیل بھی مسلمانوں نے ہی ڈالی تھی۔ یونان کا سارا فلسفہ ادب، منطق، طب، اقلیدس، ریاضی، تاریخ سب کچھ عربی میں ڈھال کر قرون وسطی میں تہذیب و تمدن کے چراغ مسلمانوں ہی نے روشن کئے تھے۔ لیکن پندرھویں صدی سے حکومت و اقتدار کا ایسا چسکہ لگا کہ تحقیقی رجحان بالکل ختم ہو چکا۔ یوروپ کے دارالعلوم اپنے دور گراں خواب سے جاگ اٹھے۔ لارڈ لٹن نے علی گڑھ کالج کا سنگ بنیاد رکھتے ہوئے کہا تھا کہ یوروپی اقوام آج بھی عربوں کا قرض

پوری طرح ادا نہیں کر پائے ہیں۔ یہ انہیں کا احسان ہے کہ یونان و روما کی تہذیبی خزانوں پر یوروپ اپنا قبضہ جما سکا اور انہیں کی وجہ زندگی کے ہر شعبہ میں ترقی کر سکا۔ کسی نے توپ ایجاد کی، کسی نے مطبع کا اختراع کیا، کسی نے قطب نما کا سراغ لگایا، کسی کو مذہبی تقلیدی و دقیانوسی کمزوریوں کو دور کرنے کی سوجھی۔ کسی کو قومیت کا جذبہ ابھارنے کا شوق لگا۔ کسی کو سمندر پار نئی دنیا کی تلاش رہی۔ غرض سارے یوروپ میں ندرت و جدت کی دھوم رہی اور مسلمان خواب خرگوش میں مست رہے۔

نتیجہ یہ نکلا کہ صرف ایک دو صدی کے اندر جو آقا تھے وہ غلام بنے، جو امیر تھے وہ فقیر ہوئے جو عالم تھے وہ جاہل بنے۔ سر سید نے اس بات پر بہت غور کیا اور صحیح طور پر سوچا کہ کسی قوم کی بلندی اس کے مال و دولت سے جانچی نہیں جاتی۔ حکومت و اقتدار سے بھی نہیں۔ بلکہ اس سے کہ اس میں کتنے اعلیٰ دماغ موجود ہیں۔ کتنے عالم، فاضل، مفکر، مدبر، محقق، سائنس دان اور ہنر مند موجود ہیں۔ سر سید اس بات سے بھی بخوبی واقف تھے کہ مذہب اسلام کی ابتداء غار حرا کی اس مبارک ساعت سے شروع ہوئی جب کہ روح الامین نے رسول عربیؑ کے سینہ کو داب کر 'اقراء' کا سبق دیا تھا۔ یعنی پڑھ۔ ہماری مقدس کتاب قرآن بھی اسی معنے کا حامل ہے۔ یعنی اسلام علم کے جوہر کو عام کرنے کے لئے ظہور میں آیا۔ تاریخ یہ بتاتی ہے کہ اسلام کا معجزہ کثرت تالیف ہے۔ اسلام سے بڑھ کر کسی اور مذہب نے حصول علم پر اس قدر زور نہیں دیا۔ رسول اکرم کا ارشاد ہے کہ ایک گھنٹہ کا تفکر ستر سال کی عبادت سے بہتر ہے۔ ایک عالم سے ایک گھنٹہ کی صحبت بہتر ہے کئی راتوں کی نماز سے۔ تعلیم کا حاصل کرنا تقویٰ کے برابر ہے۔ اس کا تذکرہ اللہ کی عبادت ہے، اس کی تحصیل اللہ کی خوشنودی ہے۔ وہ جنت کی کنجی ہے، راحت کا سامان ہے، کائنات کا ساز ہے، حقیقت کا راز ہے زندگی کا آئینہ ہے، انسان کا جوہر ہے، جنگ کا ہتھیار ہے، امن کا ساتھی ہے، غم کا سہارا ہے، مسرت کا چشمہ ہے، اللہ کا نور ہے، یہ وہ دولت ہے جو لٹانے سے بڑھتی اور بچانے سے گھٹتی ہے۔

یہ وہ تعلیمات تھیں جن کے سبب اس زمانے میں دنیا کا کوئی علم ایسا نہ تھا جس پر مسلمان

حاوی نہ ہوئے ہوں۔ ابن جوزی دو سو کتابوں کے مصنف تھے۔ مورخ ابن جابر طباری مسلسل چالیس سال تک روزانہ لگ بھگ اٹھائیس صفحوں کے حساب سے لکھتے رہے۔ محدث حمیرہ جب عراق کی گرمیوں کے موسم میں لکھتے لکھتے تھک جاتے تو ٹب میں بیٹھ کر لکھتے۔ ابن خلدون سے بڑھ کر فلسفۂ تاریخ میں، امام غزالی، ابن العربی، ابو علی سینا، فارابی، رازی، الکندی، سہروردی وغیرہ تصوف و فلسفہ میں، رومی، جامی، سعدی، فردوسی، انوری، عنصری، ظہوری و حافظ شاعری میں مستند مانے گئے۔ جب علم کا جوہر ان کے ہاتھ سے چھن گیا تو وہ قعر مذلت میں گر پڑے۔

یوروپی اقوام نے جو سبقت مسلمانوں سے چھینی اس کو انہوں نے نہ صرف بحال ہی رکھا بلکہ ایسا فروغ دیا کہ دونوں میں زمین و آسمان کا فرق نظر آنے لگا۔ سر سید کی نکتہ رس نگاہ تاریخ پر جا پڑی۔ مسلمانوں کا عروج اس لئے رہا کہ قرون اولیٰ میں مکتبہ خیال معقولات کا تھا۔ معتزلہ سوچ سے اجتہاد کے کئی امکانات مسلمانوں کے ہاتھ آئے تھے۔ جب تقلیدی و صوفیانہ میلان نے زور پکڑا تو تحقیقی و اجتہادی کام رک گیا جس کی وجہ سے ذہنی انحطاط شروع ہوا۔ اس کے برعکس یوروپ میں خصوصاً فرانسیسی انقلاب کے بعد دو اہم نکات ظہور میں آئے۔ ایک جمہوریت اور دوسرا قومیت۔ قومیت کی وجہ سے ایک نیا سیاسی شعور پیدا ہوا۔ حب الوطنی کا جذبہ، قوم کی خدمت، آپسی اتفاق و اتحاد، سماجی و معاشی حالت کی بہتری اور اپنی زبان، تہذیب تمدن، مذہب، دین اور روایات سے گہری لگن کا مادہ بھی ابھر آیا۔ جمہوریت کی وجہ شخصی اقتدار کا خاتمہ ہوا۔ عوام برسر اقتدار آنے لگے ان میں انتظامی صلاحیت پیدا ہونے لگی۔ سیاسی قوت کی بدولت کئی آزادیاں حاصل ہوئیں۔ سوچنے سمجھنے، جانچنے پرکھنے کے عادی بنتے گئے اور طرز زندگی میں نمایاں تبدیلیاں آنے لگیں۔

اٹھارویں صدی میں دو اور عظیم تحریکیں یوروپ میں رونما ہوئیں۔ ایک صنعتی انقلاب اور دوسرا سامراجیت یعنے (Colonialism)۔ صنعتی انقلاب کی وجہ سے سارا معاشی نظام بدل گیا۔ ایجادات و اختراعات سے کئی مزدوروں کا کام ایک مشین کے ذریعہ ہونے لگا۔ پیداوار میں اضافہ، تجارت میں فروغ و صنعت و حرفت کی توسیع سے ایک سرمایہ دارانہ نظام

(Capitalism) وجود میں آیا۔ مال و دولت کی افراط اور نئے نئے اسلحہ کے ایجادات سے سامراجیت کی خواہش ظہور میں آئی۔ چند ہی عرصہ میں یوروپی اقوام نئی منڈیوں کی تلاش میں ایشیاء وافریقہ پر ٹوٹ پڑے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جلد ہی ہندوستان پر انگریزوں کا قبضہ، شرق الہند پر ہالینڈ کا قبضہ، آفریقہ کے کئی ممالک پر فرانس کا قبضہ اور وسط ایشیاء پر روس کا قبضہ ہو گیا۔ مغلیہ خاندان کے زوال کے بعد سیاسی انحطاط نے ایسا زور پکڑا کہ کل برصغیر برطانیہ کے قبضہ میں چلا گیا۔

سیاسی اقتدار کے اثرات بہت گہرے تھے۔ زندگی کے ہر شعبہ میں صلیبی جنگ (Crusade) نبرد آزما تھی۔ یہ جنگ تلوار سے نہیں قلم سے لڑی جارہی تھی۔ تبلیغی کام سے مسلمانوں کو عیسائی بنانے کی ضرورت نہیں تھی۔ مسلمانوں کو مغرب کی عظمت کا لوہا منوانا، ان کے ذہنوں کو مانجھنا، ان کے روایات، طرز زندگی، تمدن اور اخلاق پر حملہ کرنا، ان کا عین مقصد تھا۔ مشنریوں کے غول کے غول بڑی چابکدستی سے کام کرنے لگے۔ مدرسہ، کالج، ہسپتال، یتیم خانے، ملازمت کے امکانات اور سیاسی ہوش مندی سے ایسا جال بچھایا جانے لگا کہ مسلمان بے بس و مجبور ہونے لگے۔ ایک ہزار سال سے زیادہ جو اسلامی تہذیب آفتاب جہاں تاب کی طرح چمک اٹھی تھی، خطرہ میں پڑ گئی۔

سر سید کے ذہنی ارتقاء کو سمجھنے کے لئے انیسویں صدی کے تاریخی منظر کو بھی ملحوظ رکھنا چاہئے۔ مسلمانان ہند کے لئے انیسویں صدی ایک نہایت ہی نازک و دشوار دور رہا ہے۔ سیاسی میدان میں ان کی حکومت واقتدار کا سیلاب جو صدیوں سے موج بیکراں کی طرح امڈ تا چلا آرہا تھا۔ یکایک زمانہ کے نشیب و فراز سے ٹکرا کر تتر بتر ہو چکا تھا۔ مغلیہ خاندان کا آفتاب اپنی ساری تابناکی کھو کر قریب الغروب تھا۔ مغربی سامراجیت کا عروج تھا۔ جو تاجر بن کر آئے تھے وہ تاجدار بن گئے تھے۔ ایک صدی سے زیادہ ان سے لڑتے لڑتے مسلمان تھک کر چور ہو گئے تھے۔ کچھ اپنی بھی کمزوریاں تھیں۔

عندلیبان چمن نے خود قفس کے شوق میں　　　　بیچ ڈالا چند کلیوں کے لئے سارا چمن

صرف بر صغیر ہند پر ہی نہیں سارے عالم اسلام پر تنزل بادل چھا چکے تھے۔ دولت عثمانیہ آخری ہچکیاں لے رہی تھی۔ ہسپانیہ کبھی کا مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ مراکش میں فرانسیسی، مصر میں انگریز، طرابلس میں اٹلی اور وسط ایشیاء میں روس کا راج تھا۔ سارے عالم اسلام پر یورو پی اقوام گدھ کی طرح منڈلا رہی تھیں۔ مصیبت تو صرف حکومت واقتدار کے گم ہو جانے کی نہیں تھی بلکہ دین، مذہب، تہذیب، تمدن، رسم ورواج، رہن سہن، تعلیم و تربیت، علوم وفنون، معاشرت، اخلاق، سبھی شعبوں پر زبردست آگ لگ رہی تھی۔ مغربی علوم، مغربی سائنس، مغربی زبان اور مغربی طرز زندگی کا ڈنکا ہر جگہ بج رہا تھا۔ یہاں بھی ملت کی کوتاہیوں اور غفلت کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔

کس رہے ہیں اپنے منقاروں سے حلقہ جال کا
طائروں پر سحر ہے صیاد کے اقبال کا

مسلمان ہند کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ ملازمتوں سے الگ کر دیئے گئے تھے۔ فوج میں بھرتی ممنوع تھی۔ زمینداری ہاتھ سے چھن گئی تھی۔ دفتروں میں داخلہ مشکل تھا۔ انگریزی زبان ذریعہ تعلیم بن چکی تھی۔ فارسی کو خارج از دفتر کر دیا گیا تھا۔ مسلمانوں کو ملک کا دشمن قرار دیدیا گیا تھا۔ ان پر صنعت وحرفت، زراعت وتجارت کے دروازے بند تھے۔ یکے دکے شریف خاندانوں کا حال بھی برا تھا۔ کہیں کنکوے اڑانے کا شوق، کہیں کبوتر پالنے کا ذوق، کہیں مرغ لڑانے کا چسکہ، کہیں مجرے، ناچ کی محفل، کہیں عشقیہ شاعری کا جنون، ہر جگہ اخلاق کی پستی، ماضی کا گھمنڈ، اسراف کی عادت، رسم ورواج کی ضد، تنگ نظری وتعصب، غرض تنزل کی ہر علامت ان میں موجود تھی۔ اس صورت حال میں ۱۸۵۷ء کا غدر قیامت صغریٰ سے کم نہ تھا۔ یہ ایسا دھماکہ تھا کہ مسلمان تلملا گئے۔ ہزاروں جانیں تلف ہوئیں۔ سینکڑوں خاندان برباد ہوئے، خون کی ندیاں بہہ گئیں۔ سارا دہلی اجڑ گیا۔ مغلیہ خاندان کے آخری تاجدار کو کوئے یار میں دو گز زمین نہ ملی۔ رنگون میں بلبلا اٹھا اور کہا

پئے فاتحہ کوئی آئے کیوں، کوئی چار پھول چڑھائے کیوں
کوئی آکے شمع جلائے کیوں، میں وہ بے کسی کا مزار ہوں

اس تاریخی پس منظر کے علاوہ پانچ اور اہم عناصر تھے جو سر سید کے ذہنی تخلیق و تشکیل کا باعث بنے۔ وہ ہیں خاندانی اثرات، کمپنی سرکار کی ملازمت، یوروپ کا سفر، اسلامی مفکروں کا اثر اور مغربی فکری نظام کا دباؤ۔ سر سید کے نس نس میں خاندانی شرافت رس بس گئی تھی۔ سر سید ایک نہایت ہی معزز اور شریف خاندان سے تھے۔ ان کا نسب ۳۵ر واسطوں سے رسول اکرم ﷺ تک جا پہنچتا ہے۔ یہ خاندان تصوف اور انتظام حکومت میں ہمیشہ نامور رہا ہے۔ آپ کے نانا دبیر الدولہ خواجہ فرید الدین احمد عالم فاضل، صوفی منش و حکیم مشرب کے علاوہ مشہور ریاضی داں تھے۔ آپ کی والدہ نہایت خوش خلیق، تعلیم یافتہ و سلیقہ دار خاتون تھیں۔ سر سید کی تعلیم انہیں کے زیر سایہ ہوئی۔ اٹھارہ سال کی عمر تک فارسی و عربی کی اچھی مہارت حاصل کرلی اور مضمون نگاری کی طرف توجہ کی۔ سید الاخبار، جوان کے بھائی نکالتے تھے اس کے لئے مضامین لکھتے تھے۔ آپ کا عنفوان شباب زندہ دل اور رنگین صحبتوں میں گذرا۔ رنگ رنگ کی محفلوں میں شرکت، باغوں کی سیر، بسنت بہار، جلسے تماشے، مجرے ناچ ہر جگہ موجود۔ آپ کا اعتراف ہے۔ "میری لائف میں سوائے اس کے کہ لڑکپن میں خوب کبڈیاں کھیلیں، کنکوے اڑائے، کبوتر پالے، ناچ مجرے دیکھے اور بڑے ہو کر نیچری، کافر، بے دین کہلائے اور رکھا ہی کیا ہے"۔ سر سید نے یہ بھی کہا "جب رند تھے تو فرہاد سے بڑھ کر تھے، جب زاہد خشک تھے تو نہایت ہی اکھڑ تھے۔ جو صوفی تھے تو رومی سے برتر اور اب قوم کے غمخوار"۔ باپ اور بھائی کے انتقال کے بعد ایک ایسا بھی انقلاب آیا کہ خود کہہ اٹھے

ہزار دام سے نکلا ہوں ایک جنبش میں　　جسے غرور ہو آئے کرے شکار مجھے

یہ ذہنی انقلاب تھا، خیال بلند کا اعلان تھا، ضمیر پاک کا رجحان تھا، راکب تقدیر کا نشان تھا اور سیرت کی پختگی کا اعجاز تھا۔ عیش و عشرت کو لات مارنا بچوں کا کھیل نہیں۔

کمپنی سرکار کی ملازمت...... ذہنی تخلیق و تشکیل میں تیسری اہم وجہ کمپنی سرکار کی ملازمت تھی۔ ٹمٹماتے ہوئے مغلیہ دربار کے بجائے کمپنی سرکار میں ملازمت کا فیصلہ بہت اہم رہا۔ انگریزوں کی دنیا کا نقشہ الگ تھا۔ یہاں اصول پسندی، فرض شناسی، دور اندیشی، علم و

حکمت کی برتری، ملک وملت سے وفاداری اور کام سے رغبت کا دور دورہ تھا۔ سر سید کی تعلیم اعلیٰ مدارج تک نہیں ہوئی اور وہ انگریزی بھی نہیں جانتے تھے لیکن ذہانت، فراست، تدبر، تفکر اور جدوجہد کا اس قدر مادہ تھا کہ وہ مستقبل کو دیکھ رہے تھے کہ آنے والا زمانہ کیا چاہتا ہے۔ انگریزوں کی صحبت کا یہ اثر رہا کہ وہ جان گئے کہ ہر قوم کی فوقیت کا انحصار ذہنی فوقیت پر ہے۔ ذہنی فوقیت سے بشر فوق البشر تک پہنچ سکتا ہے۔ یہ ذہنی فوقیت بغیر علمی تحقیق و تفتیش، تجسس و غور و فکر کے ممکن نہیں۔ چنانچہ اس دور میں انہوں نے تصنیف و تالیف کے کام میں خوب دلچسپی لی۔ "آثار الصنادید" لکھی تو اس کا چرچا فرانس تک پہنچ گیا اور گارساں دتاسی نے اس کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں چھاپ دیا۔ لندن کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی والوں نے اپنے اعزازی فیلوشپ کا شرف پیش کیا۔ کئی اور تصانیف کا انبار لگ گیا۔ جیسے "جام جم" "جلاء القلوب" "تحفۂ حسن" "تسہیل فی جرالثقیل" "کلمۃ الحق" "راہ سنت ورد بدعت" "سلسلہ الملوک" "تصحیح آئین اکبری" "تاریخ فیروز شاہی" "تاریخ ضلع بجنور" اور "سیرت فریدیہ"۔ ہم لوگوں کو ڈوب مرنے کا مقام ہے کہ ہزارہا آسائشوں کے باوجود تصنیف و تالیف کے میدان میں ہم سر سید کے گردپا کو بھی نہیں پہنچ سکتے۔ کمپنی کی ایک معمولی ملازمت میں رہ کر وہ انتہائی ذہنی کام میں مشغول رہے اور ہم ہیں کہ جن کا دھندا لکھنا پڑھنا ہے، قلم میں روشنائی ڈالنا بھول گئے ہیں۔

یہ زمانہ سر سید کے ذہنی ارتقا کا زمانہ تھا۔ مغرب کو اچھی طرح جانچنے، پرکھنے کا زمانہ تھا۔ انگریزوں کی ملازمت میں رہ کر ان کی خوبیوں اور خامیوں پر نظر ڈالنے کا زمانہ تھا۔ قوم کی گرتی ہوئی حالت دیکھ کر دل میں کڑھنے کا زمانہ تھا۔ اپنے تاریخی ورثہ کو مضبوط بنانے کا زمانہ تھا۔ مذہب، دین، سماج، سائنس، رسم و رواج، تاریخ، تہذیب پر تصنیف و تالیف کرنے کا زمانہ تھا۔ انسانی تجربات کو سمجھنے کا زمانہ تھا۔ ان کے ذوق و شوق کا اندازہ کرنے کے لئے صرف ایک مثال کافی ہے۔ جب آثار الصنادید لکھی جا رہی تھی تو قطب مینار کی بلندی کے کتبے نوٹ کرنا دشوار تھا۔ انہوں نے ایک ترکیب نکالی کہ چھینکے بنوائے۔ ان کو رسی سے ایک چھینکا، دو بلیوں کے بیچ میں ہر کتبے کے قریب بندھوالیا اور خود اوپر چڑھ کر چھینکے میں بیٹھ کر ہر کتبے کا چربہ

اتارا۔ جب چھینکے میں بیٹھتے تو ان کے ساتھی مولانا صہبائی خوف سے تھرا جاتے۔ سرسید کی ترقی کی یہ پہلی سیڑھی تھی۔ جس کا ذہن یہ سوچے کہ آسمان پر کچھ کام ہے اس لئے اوپر پہنچنا بہت ضروری ہے، اس شخص کا ذہن ضرور غیر معمولی ذہن ہوگا۔

یوروپ کا سفر ...... ذہنی تخلیق میں لندن کا قیام بھی بہت اہم رہا۔ اپریل ۱۸۶۹ء سے ستمبر ۱۸۷۰ء تک سرسید ہندوستان سے غیر حاضر رہے۔ پندرہ سولہ مہینے انہوں نے انگلستان میں جو گزارے وہاں دو بڑے کام انجام دیئے۔ ایک خطبات احمدیہ کی تصنیف جو سر ولیم میور کی کتاب کا جواب تھا اور دوسرا وہاں کے تعلیمی اداروں کی سیر اور وہاں کے کیمبرج یونیورسٹی کا نمونہ اپنے علی گڈھ میں قائم کرنے کا ارادہ۔ اس کے علاوہ ایک اور عمدہ خیال جو انہیں آیا وہ تہذیب الاخلاق کا اجراء تھا۔ اڈیسن اور اسٹیل کے اسپیکٹیٹر (Spectator) اور ٹیاٹلر (Tatlor) دیکھ کر سماجی اصلاح کے لئے تہذیب الاخلاق کا خیال لندن میں پیدا ہوا۔ اس کے علاوہ مغربی تہذیب، ان کے سائنسی کرشمے، سیاسی، سماجی و تعلیمی ادارے، صنعت و حرفت کے کارخانے، رہن سہن، عادت اطوار اور وہاں کی بڑی بڑی ہستیوں سے ملاقات، بات چیت وغیرہ سے وہ اتنے مرعوب ہوئے کہ ان کی بقیہ زندگی میں ان کی یہ کوشش رہی کہ اپنی قوم بھی زندگی کے ہر شعبہ میں مغرب کا مقابلہ کرے۔ لندن کے قیام میں یہ بات اچھی طرح واضح ہوگئی کہ ندرت فکر و عمل ہی ترقی کا راز ہے۔

لندن سے واپسی کے بعد ایک نمایاں تغیر ظہور میں آیا۔ وہ پہلے سے انگریزوں کے ثناخواں تھے، اب ہم خیال بن گئے۔ اب تک وہ اپنی تہذیب کے دلدادہ تھے، اب مغربی تہذیب کے بھی حامی بن گئے۔ اب تک مغربی تعلیم و تربیت پر سرسری نظر رہی تھی۔ اب مغربی تعلیم و تربیت سے اپنی قوم کو آراستہ کرنا ان کا نصب العین بن گیا۔ اب تک صرف مذہب اسلام کی فوقیت پر یقین تھا۔ اب اسلام اور عیسائیت کو قریب تر لانے کی کوشش میں مشغول رہے۔ انگریزوں کی مسلمانوں سے مخالفت کو دور کرنے کی غرض سے رسالۂ لائل محمڈنز آف انڈیا ترتیب دیا۔ رسالۂ تحقیق لفظ نصاریٰ لکھ کر کئی غلط فہمیوں کو دور کیا تھا۔ ملکہ وکٹوریہ کے اشتہار

معافی کا شکریہ ادا کرنے کے لئے مراد آباد شہر میں ایک عظیم جلسہ منعقد کیا تھا۔ غازی پور میں سائنٹفک سوسائٹی اور ایک مدرسہ قائم کیا تھا۔ برٹش انڈین اسوسی ایشن کی بناء ڈالی تھی۔ علی گڈھ میں انسٹی ٹیوٹ گزٹ کا اجراء کیا تھا مگر یہ سب کام اتنے اہم نہیں تھے جتنے کے لندن سے واپسی کے بعد ظہور میں آئے۔ وائسرائے لارڈ لٹن کو کالج کی سنگ بنیاد رکھنے کے لئے دعوت دینا، دیکھتے دیکھتے علی گڈھ کو گل گلزار بنانا، عالیشان عمارات تعمیر کروانا، شہرہ آفاق معلموں کو علی گڈھ بلانا، محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا قیام عمل میں لانا، تہذیب الاخلاق کا جاری کرنا وغیرہ وغیرہ انقلابی اقدام تھے جو لندن سے واپسی کے بعد ظہور میں آئے۔

علی گڈھ کالج صرف ایک کالج ہی نہیں تھا بلکہ ایک تحریک تھی جس سے مسلمانوں کی نئی زندگی مقصود تھی، ایک منصوبہ تھا جس سے قوم کی سماجی سیاسی، مالی، تہذیبی و معاشی سدھار مطلوب تھا۔ یہ مسلمانوں کی پستی ناپنے اور بلندی پر لے جانے کا آلہ تھا۔ مذہب و سائنس کے تضاد کو مٹانے کا حربہ تھا۔ مشرق و مغرب کو ملانے کا ذریعہ تھا۔ حاکم و محکوم میں رشتہ جوڑنے کا وسیلہ تھا۔ مسلمانوں کی تنگ نظری و تعصب و جہالت کو دور کرنے کا ادارہ تھا۔ ان کے تفرقوں کو مٹانے کا حیلہ تھا۔ ان کے ذہنوں میں مغربی علوم بھرنے کا طریقہ تھا۔ یہ ظلمت کی فضاؤں میں روشنی کا ایک مینار تھا۔ یہ نوحؑ کی کشتی تھی جو اس میں سمایا طوفان سے بچ نکلا۔ یہ موسیٰؑ کی لاٹھی تھی جس نے اس کو سنبھالا، اعجاز کر دکھایا۔ یہ سلیمانؑ کا تخت تھا جو اس پہ بیٹھا کرشمے کر دکھایا۔ اس کے بنانے میں سر سید کو گریۂ یعقوبؑ اور صبر ایوبؑ کرنا پڑا۔ ساتھ ہی صدق خلیلؑ زور حیدرؑ اور فقر بوذر کی ضرورت بھی پڑی۔ مگر سر سید نے اپنا کام ادھورا نہ چھوڑا۔

اسلامی مفکروں کا اثر...... یہ سوچنا صحیح نہیں کہ سر سید صرف مغرب کے زیر اثر رہے۔ مذہبیت ان کے نس نس میں بھری ہوئی تھی۔ وہ مذہب اسلام کے شیدائی تھے۔ وہ سب کچھ برداشت کر سکتے تھے۔ لیکن اسلام پر حملہ اور سرورِ کائنات کی شان میں گستاخی پر بے قابو ہو جاتے تھے۔ جب سر ولیم میور جو ان کا حاکم تھا ایسی گستاخی کا مرتکب ہوا تو لٹ لٹا کر لندن گئے اور ایسا منہ توڑ جواب لکھا کہ ولیم میور کو سر تسلیم خم کرنا پڑا۔ آخری عمر میں کسی مشنری نے

اسلام پر اعتراضات چھاپا تو آپ نے بستر مرگ پر اس کا جواب لکھوایا۔ کسی انگریز نے نواب وقار الملک کو نماز کی اجازت نہ دی تو آپ نے وقار الملک کو لکھا "تڑاق سے استعفیٰ دے دینا تھا اور صاف کہہ دینا تھا کہ میں خدائے عظیم الشان، قادر مطلق کے حکم کی اطاعت کروں گا نہ کہ آپ کی۔ کیا ہوتا، نوکری نہ میسر ہوتی، فاقے مر جاتے، نہایت اچھا ہوتا والسلام"۔ سر سید کی ذہنی تحلیق میں عالم اسلام کی تین عظیم ہستیوں کا زیادہ اثر رہا۔ وہ ہیں نجد کے محمد عبدالوہاب، دہلی کے شاہ ولی اللہ اور کابل کے جمال الدین افغانی۔

نجد کے محمد عبدالوہاب (۱۷۰۳ء تا ۱۷۸۷ء) نے جو تحریک چلائی، وہابیت کہلائی۔ سر سید اس سے بہت مرعوب ہوئے، وہ پکے وہابی تھے۔ خرافات و بدعات کے سخت خلاف تھے۔ وہابیت نے اٹھارویں اور انیسویں صدی میں بہت زور پکڑا۔ اس تحریک کا مقصد اسلامی انحطاط کو روکنا تھا۔ مغربی حملوں سے اسلام کو بچائے رکھنا تھا۔ مذہبی عقیدوں کو قرون اولیٰ کے اصلی تعلیمات سے جوڑنا تھا۔ غیر ضروری رسم ورواج وغلط عقیدوں کو مٹانا تھا۔ دین و مذہب کو صرف کتاب اللہ اور سنت رسول کے احکام پر قائم کرنا تھا۔ پیری مریدی کے خلاف سخت احتجاج تھا۔ مزاروں، گنبدوں وخانقاہوں کے سر پرستوں نے قبر پرستی وبدعت کا جو بازار کھول رکھا تھا، اس کے خلاف اعلان جنگ تھا۔ اسلامی ممالک کے ارباب حکومت کی بداندیشی، بدعنوانی، عیش پسندی وغلط رہنمائی پر سخت حملہ تھا۔ یوروپی سامراجی فتنوں کا سدباب تھا۔ پھر اس صالح نظام حیات کا احیا مقصود تھا جس کی بنیاد صرف احکام الٰہی وارشادات نبویؐ پر رکھی گئی ہو۔

یہ تحریک بہت جلد عالم اسلام میں پھیل گئی۔ اس سے یوروپی اقوام گھبرا گئے، انہیں خوف تھا کہ اسلامی اتحاد و تنظیم ان کے مفاد سے ٹکرائے گی۔ اس تحریک کے دو رخ تھے۔ ایک تو مسلمانوں کی خامیوں کو روکنا، اور خوبیوں کو ابھارنا تاکہ دین ومذہب کی اصلاح ہو اور اس میں قرون اولیٰ کی پاکیزگی آجائے۔ دوسرا سیاسی اقتدار جو مسلمانوں کے ہاتھ سے چھین لیا جارہا تھا۔ اس کا تدارک، تاکہ عالم اسلام اپنا تاریخی غلبہ باقی رکھے۔ اسلام بھی پھلے پھولے اور پھیلے اور

اعلائے کلمۃ الحق کا بول بالا ہو۔ وہ حکومت الٰہیہ کا خواب دیکھ رہے تھے جہاں صرف قرآن اور حدیث کا دخل ہو۔ وہ مستقبل یا حال کو نہیں ماضی کو اپنا پیشوا بنانا چاہتے تھے۔ سر سید اس تحریک سے بہت اثر انداز ہوئے۔ جس قسم کے عقیدے و رواج پیری مریدی کے ڈھکو سلے، سماجی طور طریقے جو اکبر کے زمانے سے مروج تھے ان سے وہ نالاں تھے۔ اورنگ زیب نے کوشش کی کہ کچھ اصلاح ہو، مگر نتیجہ مزید مضر نکلا۔ سر سید چاہتے تھے کہ کم از کم وہابی تحریک سے مسلمانوں کی مذہبی عقیدوں کی کچھ اصلاح ہو۔

شاہ ولی اللہ (۱۷۰۳ء تا ۱۷۶۲ء) سے بھی سر سید متاثر رہے۔ شاہ ولی اللہ ہماری دینی ،اخلاقی، فکری و سیاسی زندگی کے وہ سالار اعظم تھے کہ اگر انیسویں صدی سر سید کے نام سے موسوم ہے تو اٹھارویں صدی شاہ ولی اللہ کے نام سے۔ ہماری فکری نظام کے وحدت الوجود اور وحدت الشہود کی دو شاخوں میں جو اختلافات مدت سے چلے آرہے تھے، ان کا قابل قبول حل انہوں نے تلاش فرمایا۔ قرآن مجید کا فارسی میں ترجمہ کیا تا کہ عوام مستفیض ہوں، وہابی تحریک سے تصوف کے عمدہ مقامات پر بھی کاری ضرب لگ چکی تھی۔ تصوف نظام کے خامیوں کو دور کر کے اس کے اصلی مسلک کو زندہ کرنے کی کوشش کی۔ تصوف دین کا وہ جز ہے جہاں روحانی جذبات سے انسانی وجود کا اصل مقصد ہاتھ آتا ہے۔ صدق و صفا، صبر و استقلال، زہد و تقویٰ، ذکر و فکر، امید و خوف اور راز و نیاز کے ذریعے آدم خاکی علم عرفان پا لیتا ہے۔ تصوف کا تعلق تزکیہ نفس یعنی دل کی نفاست و نظافت سے ہے۔ حسن آئینہ حق ہے اور دل آئینہ حسن۔ جب دل صاف ہو تو قدرت کی تجلی اس میں چمک اٹھتی ہے۔ تصوف روحانی تعلیم کی اس منزل کو کہتے ہیں جہاں حقیقت جلوہ نما ہوتی ہے۔ صحیفۂ پاک میں بھی بشارت دی گئی ہے کہ متقیوں کا فوز عظیم قربت الٰہی ہے جو ضبط نفس و طاعت سے حاصل ہوتا ہے۔ غرض تصوف مسلمانوں کا خاص میدان رہا تھا۔

لیکن تصوف میں انتہائی مشغولیت ترقی کے راستے میں مانع ہوئی۔ رہبانیت، خانقاہیت، پیری مریدی کا سلسلہ ، عقبیٰ سے رغبت، دنیا سے نفرت نے عالم اسلام کو ایسے راستہ پر لا کھڑا

کیا جہاں سے سیاسی اقتدار، اقتصادی طاقت، علم و عمل کی کاوش، ایجادات و اختراعات کا شوق، جدو جہد کا ذوق اور اجتہاد کا دروازہ بند ہو گیا۔ مزاج خانقاہی پختہ ہونے لگا۔ فکر و ذکر صبح گاہی میں جب نظر تسبیح پر ہی رہی تو شمشیر و سناں ہاتھ سے چھوٹ گئے۔ صوفی و سالک رقص و سرود کو بھی پسند کرنے لگے۔ تصور میں قرب الٰہی پانے والے خانقاہ سے باہر نہ نکلے اور یہ نہ دیکھا کہ زمانہ کیا غضب کی چال چل چکا ہے۔ یہ تصوف کی غلطی نہیں تھی بلکہ اس کو سمجھنے والوں کی تھی ۔علامہ اقبال نے صحیح کہا ہے۔

مدعا تیرا اگر دنیا میں ہے تعلیم دین　　ترک دنیا قوم کو اپنی نہ سکھلانا کہیں

شاہ ولی اللہ پر یہ باتیں خوب واضح تھیں۔ مغلیہ خاندان کے انحطاط کو وہ آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ شمال میں سکھ، جنوب میں مرہٹے اور ہند کے قلب پر انگریز راج کر رہے تھے۔ شاہ ولی اللہ نے دین برحق کے صحیح تعلیمات کی طرف توجہ مبذول فرمائی اور کہا کہ مذہب اسلام دین و دنیا دونوں کی بہبودی چاہتا ہے۔ اخلاقی اصولوں کو سیاست، ریاست، تہذیب و تمدن سے الگ نہیں رکھا جاسکتا۔ چنانچہ عوام ان تعلیمات سے اثر پذیر ہونے لگے۔ خاص کر اس لئے کہ ان کے فرزند شاہ عبدالعزیز (۱۷۴۶ء تا ۱۸۲۴ء) اور پوتے شاہ اسماعیل (۱۷۸۱ء تا ۱۸۳۱ء) میدان عمل میں کود پڑے۔ کھوئے ہوئے وقار کو حاصل کرنا اندرونی انتشار کو روکنا، بیرونی حملوں کا جواب دینا اور صحیح دینی عقائد پر جمے رہنا ان کا پیغام تھا۔ شاہ ولی اللہ کی تعلیمات کا ایسا اثر رہا کہ رائے بریلی سے ایک بہادر جماعت سید احمد شہید کی قیادت میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ جدوجہد کرنے لگی کہ کم از کم پنجاب اور شمالی سرحد پر اغیار کے غلبہ کو روک دے۔ شروع شروع میں یہ تحریک کامیاب رہی۔ ۱۸۳۰ء میں سید احمد شہید خلیفہ منتخب کر دیئے گئے لیکن ۱۸۳۱ء میں بالا گھاٹ میں جو جنگ ہوئی اس میں نہ صرف سید احمد شہید ہوئے بلکہ شاہ اسماعیل بھی۔ انحطاط کا یہ عالم رہا کہ دہلی کے مغل شہزادوں کے کان پر جوں بھی نہ رینگی۔

سر سید یہ سارا تماشا دیکھتے رہے، یہ ابھی کم عمر تھے۔ بچپن کی مشغولیات کی وجہ سے اس وقت زیادہ متاثر نہ ہوئے۔ مگر بعد میں جب غدر کا ہنگامہ ہوا تو پچھلا سارا تاریخی منظر ان کی

آنکھوں میں گھومنے لگا۔ مسلم پستی کے ہر حادثہ سے وہ مغموم ہوتے رہے۔ شاہ ولی اللہ کی تعلیمات کو ذہن میں گھماتے رہے، قوم کی غفلت سے جگانے کی تدابیر سوچتے رہے، شاہ ولی اللہ کے لٹریچر کو اپنا ذہنی خزانہ سمجھتے رہے اور ان کے دو اہم نکات پر یعنے کیسے قوم کو اندرونی انتشار اور بیرونی حملوں سے بچایا جائے، غور کرتے رہے۔

سید جمال الدین افغانی (۱۸۳۹ء تا ۱۸۹۷ء) سر سید جمال افغانی سے بھی کافی متاثر رہے۔ گو کہ دونوں کا نقطۂ نگاہ چند باتوں میں مختلف تھا۔ افغانی بڑے جوشیلے لیڈر تھے۔ انہوں نے عالم اسلام میں ایک انقلاب برپا کرنے کی کوشش کی تھی ۔ ساحران مغرب کی سامراجی طاقتوں کو کچلنے کی اہم مہم چلائی۔ صحیح اسلامی نظام حیات و نظام فکر کی تجدید کی، ارکان دولت کو حیات ملّی وحیات ذہنی کا پیغام دیا۔ ان کے طرز زندگی کو بدلنا چاہا، ان کے اخلاق کو سدھارنے کی کوشش کی۔ ان کا آب و دانہ زمان و مکان سے ہٹ کر کبھی افغانستان، کبھی ہندوستان، کبھی ایران، کبھی انگلستان، کبھی خاقان، کبھی نجد، کبھی مصر، کبھی فرانس اور کبھی استنبول کے دستر خوان سے وابستہ رہا۔ وہ صرف عربی، فارسی، ترکی ہی نہیں بلکہ انگریزی، فرانسیسی و روسی بھی جانتے تھے۔ شخصیت میں مقناطیسی کشش اور زبان میں جادو کا اثر تھا۔ وہ جب ہندوستان آئے تو یہاں کے کروڑوں انسانوں کو دیکھ کر کہا کہ یہ اگر مکھی بن کر بھنبھناہٹ شروع کر دیں تو انگریز یہاں ایک دن بھی رک نہیں سکیں گے۔ وہ جب استنبول پہنچے تو مجلس معارف کے رکن بن گئے۔ انہوں نے آفاقی اسلامیت کا منصوبہ (Pan-Islamism) پیش کیا اور اس کی کامیابی کے لئے خوب جدوجہد کی۔ مگر کامیاب نہ ہو سکے، مصر چلے آئے اور یہاں بھی انقلابی روح پھونکنے کی کوشش کی، مگر ناکام رہے، پھر فرانس پہنچ گئے اور عالم اسلام میں تہلکہ مچانے کی غرض سے "العروۃ الوثقیٰ" کے نام سے ایک اخبار پیرس سے جاری کیا جس کا معیار مولانا آزاد کے الہلال والبلاغ کے برابر تھا۔ یہ زیادہ دیر چل نہ سکا۔ فرانس سے ایران چلے آئے۔ جب شاہ ایران کو پتہ چلا کہ افغانی کا نظام فکر جمہوری ہے تو ایران سے چھٹی دیدی گئی۔ اب یہ خاقان چلے آئے جہاں وہ عزت واحترام سے اپنے آخری وقت تک رہے۔

مرنے سے چند لمحے پہلے کاغذ قلم مانگا اور یہ لکھا 'اے اللہ تو گواہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ رحلت سے پہلے 'امتی امتی' فرماتے رہے تھے اور میں 'ملتی ملتی' پکار رہا ہوں"۔ یہ کہتے ہوئے ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ سر سید کی طرح یہ جلیل القدر انسان صرف ملت کی خدمت کے لئے زندہ رہا۔ اس کا نہ کبھی اپنا گھر تھا، نہ مکان، نہ وطن، نہ شادی، نہ بیاہ اور نہ بچے۔

سر سید اور افغانی میں کئی باتیں مشترک تھیں۔ دونوں چاہتے تھے کہ اسلام کا بول بالا ہو، ملت کی سماجی، سیاسی، تعلیمی، تہذیبی و معاشی حالت بدلے۔ پچھلا وقار بر قرار رہے۔ مغربی علوم و فنون سے روشناسی رہے، صحیح دینی جذبہ ابھرے، ان دونوں میں انقلابی جذبہ موجزن تھا۔ ان دونوں کو ملت کی خوبیوں اور خامیوں کا اندازہ تھا۔ دونوں میں غضب کی صلاحیت موجود تھی۔ دونوں قوم کے پرستار تھے، مگر دونوں کا طریقہ کار جدا جدا تھا۔ افغانی کے نزدیک ساحران مغرب فرعونی طاقتوں کے حامل تھے۔ سر سید کے نزدیک مغرب علوم و فنون کا ایک چمکتا ستارہ تھا جس کی روشنی مشرق کی تاریکی کے لئے ضروری تھی۔ افغانی ایک جوشیلے جذباتی قسم کے لیڈر تھے جن کا اسلامی ذہن چٹان کی طرح سخت تھا۔ جس پر مغربی تہذیب کے اثرات سرایت نہ کرپاتے تھے۔ اس کے برعکس سر سید صبر و استقلال، ہوش و خرد، بالغ نظری و دور اندیشی کی ایک بہتی گنگا تھے۔ جس پر مغربی ابر باراں مزید کاشتکاری کا باعث بنتا چلا جا رہا تھا۔ دونوں کا مقابلہ مغرب سے تھا۔ افغانی حضرت داؤد کی طرح مغربی جالوت کو اسلامی لاٹھی سے مارنا چاہتے تھے، مگر سر سید حضرت عیسیٰؑ کی طرح مغرب کو محبت سے رام کرنا چاہتے تھے۔ دونوں کو مغربی ذہنی فوقیت کا احساس تھا۔ افغانی اسلامی شمع کو بھڑکا کر اسلامی فوقیت پانے کے حق میں تھے۔ سر سید مغربی قمقموں سے اسلامی قصر کو منور کرنے کے حق میں تھے۔ دونوں تغیر کے حق میں تھے۔ دونوں کا منشا تھا کہ ملت اپنی مدد آپ کرے۔ دونوں چاہتے تھے کہ ملت بیدار ہو، جانب منزل رواں دواں ہو۔ فرق اتنا تھا کہ افغانی کے پاس لائحہ عمل نہ تھا۔ سر سید کے پاس ایک جچا، تلا منصوبہ تیار تھا۔ اگر افغانی ملت کے میازینی (Mazzini) تھے تو سر سید ملت کے کیاور (Cavour)۔ ایک کا کام خیالات، احساسات و جذبات کی دنیا میں گم ہو جانا تھا اور

دوسرے کا حقائق کے خوابوں کو شرمندۂ تعبیر بنانا تھا۔

مغربی فکری فوقیت کا اثر...... فکری فوقیت میں مغرب مشرق سے کوسوں دور آگے نکل چکا تھا۔ وہاں کی درس گاہیں، دانش گاہیں، تحقیق، تفتیش، صنعت، حرفت، تجارت، دولت، جمہوریت، قومیت، حکومت واقتدار کے باعث ایسی دنیا ظہور میں آئی کہ مشرق و مغرب میں زمین و آسمان کا فرق نظر آنے لگا۔ سر سید کا سیمابی و مقناطیسی ذہن ان انقلابات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ مغرب میں پچھلے تمام عقیدوں پر پانی پھر گیا۔ نیوٹن کے محوری کشش کے نظریئے نے خالق کو کائنات کی کارکردگی سے الگ کر دیا۔ ڈارون کے ارتقائی نظریے نے خالق کو حیاتی دنیا (Animal Kingdom) سے الگ کر دیا۔ کارل مارکس کے مادی نظریئے نے خالق کو مذہبی (Theology) دائرے سے الگ کر دیا۔ فرائیڈ کے نفسیاتی اصولوں نے خالق کو انسانی جذبات سے الگ کر دیا۔ اگر کسی نے یہ کہا کہ یہ کائنات اللہ میاں کی بنائی ہوئی ہے تو مغرب کا ایک بچہ پکار اٹھا کہ اللہ میاں کو کس نے بنایا؟ سوچ سمجھ اس قدر بڑھنے لگی کہ بشر فوق البشر کا دعویٰ کرنے لگا۔ یوروپ میں مفکروں کی بھرمار رہی۔ کانٹ، نٹشے، سپنوزا، ہیگل، مارکس، والٹیر، روسو، سپنسر، ڈارون، مل، میکالے، سب اپنے اپنے تصورات کے محلات تعمیر کرتے رہے جن میں جدت و ندرت تھی۔ طرز کہن کی ہر عمارت ڈھادی گئی۔ یقین و استحکام کو لغت سے نکال دیا گیا۔ ہر چیز کی ابتداء گمان پر رکھی گئی۔

اس سوچ کا یہ نتیجہ نکلا کہ کئی مکتب خیال ظہور میں آئے جن کو انگریزی میں کہا جائے تو وہ یہ ہیں۔ (Humanism, Socialism, Colonialism, Capitalism, Cummunism, Nationalism, Fabism, Positivism, Utilitarianism) وغیرہ وغیرہ۔ ان سب کا مدعا یہی تھا کہ قدرت کی بخشی ہوئی سبھی صلاحیتوں، جبلتوں اور طاقتوں کا پورا پورا فائدہ اٹھایا جائے اور وہ سب فکر انسانی کی دین ہیں۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ یوروپی اقوام نے اپنے ملکوں کو فردوس کے مانند بنالیا، اور اپنی نجی زندگی کو ایسے آرام و آسائش سے آراستہ کر لیا کہ ان کے ہر روز عید تھی اور ہر

شب، شب برأت۔ یہ قدرت کا بھی قانون ہے کہ جب بشر ندرت فکر و عمل کے سمندر میں ڈوب کر اس کی تہہ میں پہنچ جاتا ہے تو اس کو علم و حکمت کے وہ آبدار موتی نصیب ہوتے ہیں جو تسخیر کائنات کے لئے ضروری ہیں۔ سر سید جب لندن گئے تو انہوں نے ان موتیوں کو ہر جگہ بکھرے دیکھا اور ان کا جی تلملا اٹھا کہ کیوں نہ میرا دیش بھی ایسا ہی نہ ہو۔

یوروپ کی اس ذہنی ترقی کا ایک اور رخ بھی تھا۔ جہاں خود کا فائدہ تھا، وہاں اوروں کا نقصان تھا۔ ایک مثال لیجئے، عربوں نے فن تاریخ نویسی کو کمال کی حد تک پہنچادیا تھا اور اس میدان میں ابن خلدون سے بڑھ کر اور کوئی مفکر پیدا نہ ہوا تھا۔ اس کے بعد عرب تحقیقی شغل بھول گئے۔ یوروپ نے اس کو اپنایا اور اس فن کو اس قدر تقویت دی کہ انیسویں صدی فن تاریخ نویسی کی صدی کہلائی۔ مگر جب ان کی نظر ہندوستان کی تاریخ پر پڑی تو ایسا زہر گھول کر رکھ دیا کہ اس کے مضر اثرات آج تک رفع دفع نہیں ہوئے ہیں۔ مل (Mill) کی چھ جلدوں کی تاریخ ہند میں ہندوستان کی ایک اچھی چیز نظر نہ آوے گی۔ ایلیٹ (Elliot) اور ڈوسن (Dowson) نے آٹھ جلدوں میں مسلمانوں کی تواریخ کا لب لباب پیش کیا ہے مگر ایسے انداز میں کہ گویا مسلمانوں کی یہاں آمد غضب الٰہی تھا۔ ونسنٹ سمتھ کو اکبر اعظم کی صلح کل پالیسی میں کوئی خوبی نظر نہ آئی۔ رابرٹ سیول (Robert Sewell) نے وجیانگر کی تاریخ کا آغاز ایسے لفظوں میں کیا ہے کہ ہمارے برادران وطن کے خون میں تعصب کی آگ بھڑک اٹھے گی۔ مارک ولکس (Mark Wilks) اور بورنگ کی تاریخ میسور ٹیپو سلطان پر ایسی تہمتوں کا انبار ہے جس کو پڑھ کر غیر مسلم اثر لئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ یہی حال ٹاڈ (Tod) کے قلم سے نکلے ہوئے تاریخ راجستھان کا بھی ہے۔ ویلر (Wheeler) مین (Maine) سٹیفن (Stephen)، ڈاڈول (Dodwell) اور اس قبیل کے دیگر کئی مورخوں نے اپنے سیاسی مفاد کی خاطر تاریخ ہند کو بالخصوص مسلمانوں کے عہد کو، ایسا مسخ کیا کہ دو بھائی ہمیشہ لڑتے رہیں۔

سر سید کو مغرب کی ایک اور چیز بھی پسند نہ آئی، وہ قومیت (Nationalism) ہے

۔اسلام کے انقلابی اصول خالق کی وحدت اور خلقت کی وحدت ہے جو قومیت کے نظریہ سے ٹکراتی ہے۔ حسب، نسب، ذات پات، نسل، رنگ، روپ، لسانی یا جغرافیائی حدود کا لحاظ کیے بغیر کلمۃ الحق کے ماننے والوں کو اسلام ایک قوم تصور کرتا ہے۔ مگر یوروپ کا نظریہ اس کے برعکس ہے جہاں کسی خاص خطہ کے باشندے، ایک بولی، ایک نسل اور ایک ہی قسم کی سماجی، سیاسی، ثقافتی و معاشی طرز زندگی کے لئے راضی ہوں تو وہ ایک علحدہ قوم خیال کی جائے گی۔ سوچنے کے انداز میں تفاوت کی وجہ یوروپ کئی ملکوں میں بٹ گیا ہے۔ انگلستان، فرانس، جرمنی، اٹلی، سبھی یوروپ کے خطے ہیں جو نسل، رنگ، روپ، مذہب، تہذیب، تمدن و طرز زندگی میں مشترک ہیں۔ پھر بھی اپنے آپ کو ایک علحدہ قوم تصور کرتے ہیں۔ انگلینڈ اور آئرلینڈ میں زبان کا بھی فرق نہیں۔ سر سید کا خیال تھا کہ خلقت کو خانوں میں بانٹنے کے بجائے ان کو وحدت میں جوڑنے کا عمل بہت مناسب رہے گا۔ یوروپ مذہب کو سیاست سے الگ رکھنا چاہتا ہے مگر اسلام اس کے لئے راضی نہیں۔ قومیت کا ایک مسئلہ تھا جس پر سر سید یوروپ سے اتفاق نہ کر سکے۔

غرض آخر میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ سر سید کے ذہنی ارتقا کا سب سے اہم عنصر مذہب اسلام ہے۔ وہ جانتے تھے کہ قرآکریم کی پہلی وحی علم و قلم کے بارے میں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ سر سید کے سینے میں مذہب اور ہاتھ میں قرآن، دل میں جوش اضطراب درد، جسم میں زندہ روح اور ذہن میں قوم اور ملک کی ترقی کی دھن تھی۔ لدھیانہ کے مشن سکول کے ایک طالب علم کو مخاطب کر کے آپ نے کہا تھا "اے عزیز بچو! اگر کوئی آسمان کا ستارہ ہو جائے، مسلمان نہ رہے تو ہم کو کیا، وہ ہمارے قوم میں نہ رہا"۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ "وہ قوم نہایت بدنصیب ہے جو اپنے بزرگوں کے ان کارناموں کو جو یاد رکھنے کے قابل ہیں بھلا دے یا ان سے بے خبر رہے"۔ یہ بھی کہا "کسی قوم کے لئے اس سے زیادہ بے غیرتی نہیں کہ وہ اپنی تاریخ کو بھول جائے اور اپنے بزرگوں کی کمائی کھودے"۔ ان کے نزدیک ہمارا قافلہ بڑھنے کا یہ طریقہ تھا کہ ہمارے دائیں ہاتھ میں فلسفہ ہو، بائیں ہاتھ میں نیچرل سائنس ہو اور ہمارے سر پر لا الٰہ الا

اللہ کا تاج ہو۔ تاریخ اسلام کا یہ سبق انہیں یاد تھا کہ علم غذا سے زیادہ ضروری ہے کیونکہ غذا کی ضرورت شب و روز میں صرف تین مرتبہ ہوتی ہے لیکن علم ایک ایسی ضرورت ہے جو ہر آن، ہر لمحہ اور ہر قدم پر چاہئے۔

غرض سر سید کا ذہنی شجرۃ الطیبہ، شان اسلام کے بیج سے بویا گیا، خاندانی شرافت کے خون سے سینچا گیا۔ مفکران اسلام کے تفکرات سے اس کی آبیاری ہوئی۔ مغربی خیالات کے ابر باراں سے اس میں تازگی آئی۔ مگر اس شجر کی توانائی کا راز سر سید کے ضمیر میں مضمر تھا۔ اس شجر کا ہر پتہ ان کی کاوش سے پھول بن گیا جس کی مہک سارے عالم میں پھیل گئی۔ اور وہ مہک آج بھی باقی ہے۔

7787